کسی بھی قتل عام کی صورت میں ہمارے مقتولین کا قصاص واجب ہوگا

جنگی حالات پیدا کرنے یا جنگ مسلط کرنے والوں کے لیے قرآن حکیم کا بالواسطہ انتباہ

ڈاکٹر مفتی محمد عارف خان ساقی

ایسوی ایٹ پروفیسر، کلیۂ معارف اسلامیہ جامعہ کراچی، کراچی

Abstract

Islam is a religion of peace, protection and prosperity. This religion was brought by Hazrat Muhammad (PBAUH) about 1400 years ago. This religion was named by Allah as "Islam". And it is due to its nature of peace and the protection of the lives. This is not a simple saying but based on real facts. The word Islam is derived from "SALAMAT" which means "being protected from all kinds of life threatening things." Second most important word in Islam is "EEMAAN ". In the holy Quraan it is used for having faith on the religion of Islam. The word "EEMAAN" is derived from "AMAN" (Peace). Before Islam there was a tradition in Arabs that whenever any of their enemies surrenders and hands over himself to them, they give him "AMAAN ". After giving "AMAAN ", they were legally and ethically bound and responsible to save him from all kinds of life threatening things. It calls in Arabic "AMAAN ". In this situation the derivation of the word "EEMAAN" from "AMAN" and "AMAAN" is meaningful for the world of intellectuals. The name of this religion "ISLAM" and the faith on this religion "EEMAAN" both are indicating the peace, protection and prosperity for human being. Islam doesn't allow any kind of brutality and sabotage of human assets. A willful murder or homicide of any of human being is strictly prohibited in Islam unless it is a sort of execution under the law procedure.

Keeping in view the above mentioned facts we are very clear that the Holy Quraan by using term of "اَلْــقَتْــلٰــى"(AL-QATLAA) in Al-Baqarah: 178, provides the law of "قِــصَــــــــــاص" against a general massacre. Discussing the Quraanic term "اَلْقَتْلٰى" , this research is enlightening the theme in a different angle and a meaningful manner.

Key Words:Aman,Eemaan,Execuation.

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے(الانبیاء: ۱۰۷)۔ ہمارا دین ہی ''اسلام'' کے نام سے ''مُعَنوَن'' ہے۔ یہ لفظ سلامتی سے مشتق ہے۔ دین اسلام پر یقین واعتماد کو ''ایمان'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ لفظ امن سے مشتق ہے۔ یعنی ہمارے دین کا خمیر ہی ''امن وسلامتی'' سے اٹھایا گیا ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ دین قتل وغارت گری اور خونریزی کا داعی یا حامی بن جائے؟ مکہ مکرمہ میں قیام کے تیرہ برس رسول کریم ﷺ نے دشمنوں کی ہر طرح کی اشتعال انگیزی کے مقابلے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پر امن جدوجہد فرمائی ہے۔ دشمنوں کی چالوں اور حیلہ سازیوں سے حالات جب اِس حدتک ناسازگار ہوگئے کہ مکہ مکرمہ میں مزید قیام ہی ممکن نہ رہا تو اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ طیبہ میں جا بسے۔ یہی ہجرت ہے۔ پھر مدینہ طیبہ میں بدر واحد اور احزاب کے معرکوں کے اسباب ومحرکات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سراسر قریش مکہ ہی کی تحریک وخواہش کا نتیجہ تھے۔ مکی زندگی میں عملاً جو ضابطہ وقانون مؤثر ونافذ العمل رہا ہے اُس کی صراحت لفظی سے کوئی کیسے انحراف کرسکتا ہے؟ ارشادِ باری ملاحظہ کیجیے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان:۵۲)

''تو آپ کفار کا طرزِ عمل اختیار ہی نہ کریں اور اِس قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ بڑا جہاد جاری و ساری رکھیں۔''

اب غور کیا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم تو سراسر ہدایت ہے۔ حکمت ودانش کا منبع وسرچشمہ ہے۔ اور اسی پر بس ہے۔ کوئی ہتھیار اٹھانے اور آزمانے کی تو بالکل بھی اجازت ہی نہیں ہے۔ پھر جب کفارِ مکہ کے غیض وغضب کے بپھرے ہوئے طوفان مدینہ طیبہ کا رخ کرتے ہیں تو مزاحمت ومدافعت کے لیے مسلمانوں کے یہ بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ ہتھیار بندوں کے مقابل ہتھیار اُٹھانے کی اجازت اور حق واختیار تفویض بھی ہوا ہے تو کس طرح سے اور کن کلمات کے ذریعے سے؟ آپ خود ملاحظہ فرمائیں یہ قرآن حکیم کے صریح کلمات ہیں۔ ارشاد ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ، اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج:۳۹۔۴۰)

''حق واختیار عطا کردیا گیا ہے اُن لوگوں کو بھی جن کے اوپر جنگ مسلط کی جارہی ہے اِس لیے کہ ان کے اوپر ظلم ہوا ہے اور بات یہ ہے کہ اللہ ان کی مدد ونصرت پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں ناحق اِن کے کوچہ ودیار سے نکال باہر کردیا گیا، اِنہوں نے یہی تو کہا تھا کہ ہمارا پروردگار بس اللہ ہے۔''

محض اختلاف عقیدہ کی بنا پر مکہ مکرمہ میں جینا دوبھر کردیا جائے۔ گھربار اور اپنے مال ومنال سے بھی محروم کرکے ہجرت پہ مجبور کردیا جائے۔ اور پھر حد یہ کہ مدینہ طیبہ میں بھی چین سے نہ رہنے دیا جائے تو کوئی بھی انصاف پسند طبیعت رکھنے والا شخص خود فیصلہ کرکے بتادے کہ مسلمانوں کی اِس جوابی حکمت عملی سے بہتر کوئی جواب ممکن ہے؟ کیا اِس میں کسی بہتری کی کوئی گنجائش بچتی ہے؟ مسلمان اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا دفاع نہ کرتے تو اَور کیا کرتے؟ بطورِ تمثیل ایک حکایت پیش خدمت ہے اِس پہ ذرا غور کیجیے:

''ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ اگر کوئی درندہ تمہارے پیچھے پڑ جائے تو تم کیا کروگے؟ اس نے جواب دیا کہ میں بھاگ جاؤں گا۔ پہلے شخص نے کہا تم بھاگو گے کہاں؟ تم جدھر بھی جاؤ گے وہ تمہارے پیچھے آرہا ہے۔ اِس نے جواب دیا کہ میں بھاگ کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں گا۔ پہلے شخص نے کہا اگر وہ تمہارے پیچھے پانی میں کود پڑے تو پھر تم کیا کروگے؟ اِس نے جواب دیا کہ پانی سے نکل کر پہاڑ پہ چڑھ جاؤں گا۔ کہنے لگا: وہ وہاں بھی پیچھے پیچھے پہنچ جائے تو؟ جواب دیا میں درخت پہ چڑھ جاؤں گا۔ کہنے لگا: درندہ درخت پہ چڑھ جائے تو؟ اِس نے کہا: میں چھلانگ لگا کر نیچے غار میں داخل ہو جاؤں گا۔ کہا: وہ غار میں بھی پیچھے آجائے تو؟ جواب دیا کہ میں غار کے دوسرے راستے سے نکل کر باہر بھاگ جاؤں گا۔ اب پہلا شخص کہنے لگا: غار میں کوئی دوسرا راستہ موجود ہی نہیں ہے اور اِدھر سے درندہ آرہا ہے۔ تو بے بس و لاچار ہو کر اُس نے جواب دیا کہ صاحب پھر میں کیا کروں گا۔ آگے جو بھی کرے گا درندہ کرے گا۔''

اسلام اپنے پیروکاروں کو پُرامن دیکھنے کا خواہشمند ضرور ہے مگر اِن کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو درندوں کے آگے پھینک دینے اور ان کا تر نوالہ بنانے کا بھی ہرگز روادار نہیں ہے۔ دوسرے شخص نے آخر میں جس بے بسی اور لاچارگی کا اظہار کیا اور خود کو درندے کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ مؤقف اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ اسلام اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سب تو درندے کی خواہش و مرضی کے مطابق ہی ہوا ہے۔ وہ جان لینے کے لیے پیچھے نہ لگتا تو اُس کے آگے آگے بھاگنے کا کسی کو شوق تو نہیں تھا۔ لہٰذا اب تمہاری باری ہے کہ خود سپردگی دینے کی بجائے تم آگے بڑھو اور اُس خونخوار درندے کے جبڑے چیر کے رکھ دو۔ تو بتایئے کہ اِس میں برائی کیا ہے؟ اسلام، جنگ اور بدامنی کا حامی یا خواہشمند کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

سانحہ آرمی پبلک اسکول پشاور، جس میں سیکڑوں کم عمر اور معصوم بچوں کے سر اور چہروں پہ گولیاں برسا کر شہید کیا گیا ہے، تاریخ انسانی کے بدترین اور انتہائی شرمناک واقعات میں سے ایک ہے۔ جس درندگی اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے اِس کی مذمت کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ اسی طرح کراچی میں صفورا چورنگی کے قریب بھی اسماعیلی برادری کی مسافر بس پر حملہ کیا گیا اور سفاکیت کی وہی تاریخ یہاں بھی دہرائی گئی ہے۔ یہ واقعات قتلِ عام کے طویل سلسلے کی صرف دو کڑیاں ہیں۔ پاکستان میں اس نوع کا قتلِ عام کرنے اور قیامتیں ڈھانے کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔ یہی نہیں ہم نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ پورے عالمِ اسلامی میں اس نوع کے قتلِ عام کے واقعات روز کا معمول بن چکے تھے۔ کشمیر، بوسنیا، بیروت، عراق، شام، افغانستان کو بارہا خونی غسل دیا جا چکا ہے۔ خونِ مسلم کی ارزانی کی ایک کربناک اندرونی و داخلی صورتحال پورے عالمِ اسلامی کو درپیش ہے۔ دوسری طرف بیرونی جارحیت کے سب دروازے بھی کھلے پڑے ہیں۔ کہیں کوئی روک نظر ہی نہیں آتی۔ افراد کی عددی قوت کے اعتبار سے دنیا کی دوسری بڑی قوم یعنی پورا عالمِ اسلامی عدم تحفظ کے خوف کے تحت جینے پہ مجبور ہے۔

اِن واقعات کے سدّ باب کے لیے کم از کم ملکی و قومی سطح پر ٹھوس عملی اقدامات کی فوری اور اشد ضرورت تھی۔ مایوسی و نامرادی

کے سائے بھی لگا تار تعاقب کرتے رہے۔حتیٰ کہ قومی قیادت نے جب ان حالات سے نبرد آزمائی کا عزم مصمم کر لیا اور ''ضربِ عضب'' کی کمان سنبھالی تو اپنے تجزیہ کار بھی برملا کامیابی کے امکانات کو چالیس فیصد سے زائد ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔مگر سیاسی و عسکری قائدین نے بصیرت و عملی مہارت کا ایسا فقید المثال مظاہرہ کیا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ الحمدللہ علی احسانہ کہ ''ضربِ عضب'' نے فقید المثال اور تاریخ ساز کامیابیاں حاصل کی ہیں۔اور ناقابل یقین حد تک کم وقت میں مکمل کامیابی سے ہمکنار ہو کر ملکی بہادر افواج اور دیگر ادارے اب دہشت گردی کی باقیات کی بیخ کنی کی طرف متوجہ ہیں۔اگر یہ تسلسل برقرار رہا تو ہم اپنے وطن عزیز میں اپنی نئی نسلوں کے لیے ایک روشن و تابناک مستقبل کی امید کر سکتے ہیں۔

ہم صدیوں سے خانہ جنگی میں مبتلا ہیں۔اور یہ سب گروہی بالا دستی کی منہ زور خواہش کے تحت ہو رہا ہے۔یہ منہ زور خواہش ان قوتوں کو غیر ملکی ایجنسیوں کے آستانوں تک لے جاتی ہے۔وہاں سے ان کو مدد بھی ملتی ہے اور ذہن سازی بھی یہ ایجنسیاں اپنے مطلوبہ اہداف کو سامنے رکھتے ہوئے ہی کرتی ہیں۔اِس طرح ایجنڈا اغیار کا ہی ہوتا ہے۔اور یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ غیر ملکی طاقتیں ان کے اوپر بہت مہربان ہیں۔اِس خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی مسلم امہ کی عالمی بے توقیری کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں ہر کہیں مسلمان غیر محفوظ ہیں۔کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ، استصواب رائے کی اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی پروا کیے بغیر جاری ہے۔عوامی سطح پر غیر مسلح تحریک آزادی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔اس کے باوجود بھارت کشمیریوں کے قتل عام سے باز آنے پر تیار نہیں ہے۔پیلٹ گنز کے استعمال سے جہاں انسانی جانوں کا اتلاف ہو رہا ہے وہیں بڑی تعداد میں لوگوں کو بینائی سے بھی محروم کیا جا رہا ہے۔حریت رہنماؤں کے ساتھ وہ سلوک کیا جا رہا ہے جو جنگی مجرموں کے ساتھ بھی انسانیت روا نہیں سمجھتی۔کشمیر پر غاصبانہ قبضہ جمائے سات دہائیاں پوری ہونے کو ہیں۔یعنی لگ بھگ ۷۰ سال۔بھارت کی خواہش تھی کہ جب گردش ایام میں ایک نسل دنیا سے ہی گزر جائے گی تو اگلی نسل کو آزادی کا سبق یاد ہی نہیں رہے گا۔مگر نئی نسل نے تحریک آزادی کی قیادت سنبھال کر بھارت کی ان امیدوں پہ پانی پھیر دیا ہے۔نوجوان شہیدِ آزادی برہان مظفر وانی اِس کی اب ایک کبھی نہ مٹنے والی دلیل اور زندہ مثال ہیں۔اللہ پاک نے اِس نوجوان کو اِس کی قربانی کا اتنا بڑا انعام عطا فرمایا ہے کہ ایک عظیم ہیرو کی طرح اب رہتی دنیا تک تمام کشمیریوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔اقوام متحدہ میں عالمی رہنماؤں کی موجودگی میں پاکستان کے وزیر اعظم نے اِس شہیدِ آزادی کا نام لے کر خراج تحسین پیش کیا ہے جس کی گونج عالمی سطح پر سنائی دے رہی ہے۔کوئی شک نہیں کہ شہید آزادیٔ کشمیر برہان مظفر وانی امر ہو گئے ہیں۔

تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان اگر موازنہ کرنے کی کوشش کی جائے تو پاکستان کو حاصل بہت بڑی اور واضح برتری صاف نظر آئے گی۔اتنی واضح کہ دونوں میں کوئی موازنہ ہی نہیں بنتا۔بھارتی قیادت نہایت درجہ پست ذہنیت کی حامل ہے۔جبکہ اِدھر پاکستان سیاسی تجربہ و بصیرت اور تدبر و تحمل رکھنے والے میاں محمد نواز شریف برسر اقتدار ہیں۔جنہوں نے بہت مختصر مدت میں ملک و قوم کو تعمیر نو کی راہ پہ ڈال دیا ہے۔پاک چین اقتصادی راہداری میاں محمد نواز شریف کے تدبر اور بصیرت کی ایک روشن مثال ہے۔ایکسپریس نیوز ۹ اکتوبر ۲۰۱۶ کی فراہم کردہ

اطلاع کے مطابق ورلڈ بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے تحقیقی اور اشاعتی ادارے ''ایمر جنگ مارکیٹس'' نے پاکستان کو جنوبی ایشیا کا بہترین انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ ملک قرار دیا ہے۔ جبکہ ایمر جنگ مارکیٹ ایوارڈ دینے کی تقریب واشنگٹن میں منعقد ہوئی جہاں وفاقی وزیر منصوبہ بندی وترقی احسن اقبال نے ایوارڈ وصول کیا۔ بین الاقوامی ادارے کی جانب سے ایوارڈ انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ، توانائی اور ٹرانسپورٹ منصوبوں میں سرمایہ کاری پر دیا گیا۔ جب کہ گزشتہ روز اسی ادارے کی جانب سے وفاقی وزیر خزانہ اسحاق ڈار کو بھی ۲۰۱۶ء کا جنوبی ایشیا کا بہترین وزیر خزانہ قرار دیا گیا تھا۔ یہ محض ایک مثال ہے۔ ورنہ عالمی سطح پہ مثبت اشارے ایک تسلسل کے ساتھ پاکستان کی تعمیر وترقی کے حق میں مل رہے ہیں۔ کچھ قوتیں اسی سے خائف ہو کر ملک میں بے چینی اور قیادت میں عدم یکسوئی پیدا کرنے کے لیے لندن میں بار بار جا کر سر جوڑ کر بیٹھتی ہیں۔ مگر یہ موروکھوں کا ٹولہ ہے، نامراد ہی ہوگا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب ۲۰۱۶ء تک کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان کو اتنی بڑی اور واضح برتری تاریخ میں پہلے کبھی بھی میسر نہیں آئی ہے۔ بھارت کا قومی مرکز سب کی نظروں کے سامنے بکھرتا چلا جا رہا اور وہ بہت تیزی کے ساتھ لامرکزیت کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ پاکستان میں پہلی بار قومی وحدت ویکجہتی اور ایک محکم مرکزیت کی بنیادیں مضبوط ہو رہی ہیں۔ اُدھر بھارت میں انتہا پسندی اقتدار پہ قابض ہے۔ پاکستان میں عین انہی دنوں انتہا پسندی کے عفریت کا سر پوری طرح سے کچل دیا گیا ہے۔ پاکستان کی طرف بنیادی ڈھانچے کی تعمیر نو اور ملک وقوم کی مضبوطی واستحکام کے آثار بہت نمایاں ہیں۔ اُدھر بھارت میں انتہا پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات، مقامی اقلیتوں کے اندر عدم تحفظ کے احساسات کے ساتھ ساتھ نادان قیادت کی نری اور کھوکھلی جذباتیت بڑی حد تک بھارت کو شکست وریخت کی راہ پر لے آئی ہے۔ بلاشبہ بھارت دنیا ومافیہا سے بیگانہ ہو کر کشمیر میں اپنی ہی قبر کھودنے میں دن رات ایک کر رہا ہے۔

فنِ حرب وضرب کا معاملہ ہو تو پاکستان کی مسلح افواج اپنی مہارت کا عالمی سطح پہ لوہا منوا چکی ہیں۔ حتیٰ کہ عالمی طاقتیں بھی اپنے فوجی جوانوں کو پاکستانی افواج کے ساتھ تربیتی مشقوں پہ بھیج رہی ہیں۔ میاں محمد نواز شریف اور جنرل راحیل شریف جیسے بڑا پن اور بڑا ذہن رکھنے والے سیاسی وعسکری قائدین کا ان وقتوں میں بیک وقت پاکستان کے منظرنامے پہ آنا اِس ملک وقوم کے لیے ایک بڑا عطیہ خداوندی ہے۔ اور قدرت اپنے عطیات کی حفاظت اور قدر کروانا بھی جانتی ہے۔ یہ صورتحال کشمیریوں کے لیے حوصلہ افزا اور نیک بختی کی نوید ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ ''حقِ خودارادیت'' کشمیریوں کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔ اِس سے دستبردار ہو جانا کشمیریوں کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ دوسرے ہاتھ پہ بھارت کی ضد اور ہٹ دھرمی اور عالمی برادری کے سامنے پوری ڈھٹائی کے ساتھ ''اٹوٹ انگ'' کی رٹ کے باعث خدشہ ہے کہ کشمیریوں کے قتل عام سے بھارت آسانی کے ساتھ دست کش نہیں ہوگا۔

پورے عالم انسانی کو جس خاص پہلو پہ اِس وقت متوجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ''بھارت کشمیر پر اپنے غاصبانہ قبضے کو جواز فراہم کرنے اور دوام دینے کے لیے پاکستان کے اندرونی علاقوں مثلاً کراچی، بلوچستان اور پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں بدامنی پھیلانے اور قتل وغارت گری کرانے میں مصروف ہے۔ اور اِس پر بے تحاشا سرمایہ بھی لگا رہا ہے۔ انڈیا کا حاضر سروس نیوی اہلکار کل بھوشن یادیو اور اس کے ساتھی اِس کی ایک بڑی مثال ہیں۔ محض دنیا کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مقبوضہ کشمیر میں

اگر امن نہیں ہے تو پاکستان میں کون سا امن وامان کا دور دورہ ہے؟ بھارت، کشمیریوں کا قتل عام کرتا ہے اور اپنی اِس مذموم حرکت کو آڑ مہیا کرنے کے لیے پاکستان میں بھی اپنے ایجنٹ چھوڑ کر قتل عام کراتا چلا جا رہا ہے''۔

اِس بات میں اب کوئی شک وشبہ باقی نہیں بچا ہے کہ پاکستان میں قتل وغارت گری میں ملوث گروپس کو غیر ملکی مالی وتکنیکی معاونت اور مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔کیا انسانیت کا درد رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نہایت تکلیف دہ صورتحال نہیں ہے؟ کیا کوئی بھی سلیم الفطرت شخص بھارت کو اِس بات کی اجازت دے گا کہ کشمیر پر اپنا غاصبانہ قبضہ برقرار رکھنے کے لیے کشمیریوں کا بھی قتل عام کرتا رہے اور پورے جنوبی ایشیا میں بھی ہر طرف خون کی ہولی کھیلتا چلا جائے اور کشمیریوں کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کے حق سے محروم رکھنے پہ اڑا رہے؟ یہ طرزِ عمل خود بھارتیوں کے حق میں بھی نہایت خطرناک اور مہلک ہے۔مکافاتِ عمل کے قدرتی اور کائنات کے ریاضیاتی قانون خود بھارتیوں کو بھی بہت جلد تباہی و بربادی کی طرف لے جائیں گے۔اور ان کو اِس خونِ ناحق کی بہر طور قیمت چکانی ہی پڑے گی۔کیا اہلِ بھارت کی عقلیں فی الواقع بانجھ ہیں؟ قبل ازیں ۱۹۷۱ء میں مکتی باہنی کے ذریعے قتلِ عام کرانے اور پاکستان توڑنے یعنی سابق مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کے عمل میں خود بھارت کے موجودہ وزیر اعظم بھارت کے بھرپور کردار کو تسلیم بھی کر چکے ہیں۔

پاکستان اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے کشمیریوں کی سفارتی واخلاقی حمایت کرتا ہے تو بھارت کی طرف سے پاکستان کو بھی جنگ کی دھمکیاں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔اور پورے خطے پر جنگ کے مہیب سائے منڈلانے لگتے ہیں۔تو اِس بات کا کیا جواز ہے کہ پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھارت کشمیریوں کے حق خود ارادیت سے مسلسل انکار کرتا رہے؟ حالانکہ مسلمہ طور پر کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور اِس کا ثبوت کشمیر میں استصوابِ رائے کرانے کا اقوامِ متحدہ کا وعدہ اور اس کے ایجنڈے پر موجود اس کی قراردادیں ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جب تک کشمیریوں کو ان کا حق نہیں ملے گا، پورے خطے کا امن یونہی داؤ پہ لگا رہے گا۔اور کشمیر سمیت دیگر علاقوں میں بھی خون کی ندیاں اسی طرح بہتی رہیں گی۔لہٰذا اپنے اپنے مفادات سے بالاتر ہو کر اس قتل عام کو رکوانا اور اِس کی بنیاد یعنی مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کی رائے کے مطابق حل کرانا عالمی برادری کی انسانی ذمہ داری ہے۔

جب بھی کوئی مشکل کی گھڑی آ پڑتی ہے تو بحیثیت مسلمان ہمارا ذہن قدرتی طور پر قرآن حکیم ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ ایسی درندگی اور سفاکیت کے معاملے میں کتاب اللہ کس طور پر ہماری رہنمائی فرماتی ہے؟ یہ بھی واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ فی زمانہ ایک عام تاثر یہی ہے کہ قرآن حکیم میں اِس نوع قتل اور اس کے تعلق سے شرعی احکام کا کہیں کوئی ذکر موجود ہی نہیں ہے۔لہٰذا اِس مذکورہ بالا سوال کا جواب نفی ولاعلمی ہی کی صورت میں سامنے آئے گا۔ہمارے اِس ایمانی واعتقادی دعوی کے باوجود کہ قرآن حکیم ہر معاملے میں ایک رہنما اصول دیتا ہے۔کہا اور بتایا یہی جائے گا کہ قرآن حکیم میں ایسی کسی شکل وصورت کا ذکر ہی نہیں ملتا۔مگر حقیقت اِس بیان کے برعکس ہے۔اس لیے یہ صورتحال اپنے ایمان وعقیدے میں ایک خاموش اور غیر محسوس طور پر اپنا وجود بنا کر رسوخ پیدا کر لینے والی تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے۔ہمارا یہ رویہ، قرآن حکیم کی رو سے اگر دیکھا جائے تو اس الہامی تعلیم و ترغیب کے سراسر منافی عمل ہے جس کے الفاظ حسبِ ذیل وارد ہوئے ہیں:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد:۲۴)

''تو آیا یہ قرآن پر تدبر و تفکر ہی نہیں کرتے یا ایسا ہے کہ ان کے دلوں پر دلوں کے تالے پڑ گئے ہیں۔''

قرآنِ حکیم میں ''قتلِ عام'' کا اور اِس کی سزا کا ذکر تو آیا ہے مگر ہوا یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی رعایت لفظی کے لحاظ کے معاملے میں ایک چھوٹی سی نادانستہ غلطی نے معاملے کو مختلف رُخ دے دیا ہے۔ اَب بدلے ہوئے حالات میں جب امتِ مسلمہ میں فقط قرآن خوانی پر اکتفاء سے آگے بڑھ کر قرآن خوانی کے ساتھ ساتھ قرآن فہمی کی طرف بھی توجہ مبذول ہونے لگی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس فروگزاشت کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ ترجمہ نگار حضرات اور ترجمہ کی وساطت سے قرآنِ حکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے جملہ اہلِ ذوق بھی ایک اہم معاملہ میں محتاط ہو جائیں اور قرآن حکیم کے احکامات کو صحیح تر تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

یہاں یہ اصول بھی یاد رکھا جائے اور پوری طرح سے یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ ''ہر کہنے والا اپنے کہے کی حد تک ہی ذمہ دار ہوتا ہے''۔ کسی کے کہے کا کوئی شخص اگر غلط طور سے کوئی اَور ہی معنی لے بیٹھا ہے تو اِس کے نفع و نقصان کی ذمہ داری اُس قول کے قائل کی ہرگز نہیں بنتی۔ الا یہ کہ کلام میں ایسا جھول موجود ہو جو اِس غلط فہمی کی بنیاد بنا ہو۔ اَور معاملہ اگر قرآنِ حکیم کا ہے تو اِس میں تو کسی بھی طرح کا کوئی جھول ممکن ہی نہیں ہے۔ بفرضِ محال، اگر کوئی نقص وعیب ہوتا تو قریشِ مکہ اور اُن کے ہم نوا اہلِ زبان، جن کا قرآنِ حکیم کے ہاتھوں سارا وقار اور سیاسی و مذہبی اقتدار ڈوب رہا تھا، ایک طوفان کھڑا کر دیتے۔ اور اُس غلطی کی نشاندہی کر کے اور اِس کو بنیاد بنا کر ہی پوری اسلامی تحریک کو ملیا میٹ کر سکتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ غرورِ زبان دانی و سخن فہمی میں مبتلا تمامی دشمنانِ اسلام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قرآنِ حکیم خود ہی اِس حقیقت سے پردہ کچھ یوں اٹھاتا ہے کہ کسی لسانی نقص وعیب کی موجودگی میں ایسا اعلان ممکن ہی نہ ہوتا۔ سورہ زمر میں دوٹوک انداز میں یہ اعلان کرتا ہے:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (الزمر:۲۸)

''ایک فصیح و بلیغ قرآن کی حیثیت سے یہ ہر طرح کی کجی سے پاک ہے تاکہ اِن لوگوں میں تقویٰ کا جوہر مضبوط ہو جائے۔''

آمدم برسرِ مطلب، قرآنِ حکیم، ناحق کسی کی جان لینے اور قتل کر دینے کے حوالے سے مختلف مقامات پہ مختلف اور ممتاز از یک دگر احکامات صادر کرتا ہے۔ اِن تمام مقامات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو قتل کے تعلق سے تین مختلف اقسام سامنے آتی ہیں:

قتلِ خطاء

پہلی قسم ''قتلِ خطاء'' ہے۔ اور اس کے حوالے سے حکمِ قرآنی حسبِ ذیل ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (النسآء:۹۲)

''اور کسی مؤمن کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کردے سوائے اس کے کہ غلطی سے ہو جائے اور جس کسی نے بھی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دیا تو کسی مؤمن غلام کو آزاد کرنا اور اس کے اہل خانہ کو دیت کی ادائیگی کو یقینی بنانا لازم ہے سوائے اس کے کہ وہ صدقہ سمجھ کر معاف کر دیں، تو اگر اس کا تعلق ایسی قوم سے تھا جو تمہاری دشمن ہے اور وہ مؤمن تھا تو کسی مؤمن غلام کو آزادی دلانا لازم، اور اگر وہ ایسی قوم کا فرد تھا جس کے ساتھ تمہارا معاہدۂ امن موجود ہے تو اس کے اہل خانہ کو دیت کی ادائیگی کو یقینی بنانا اور کسی مؤمن غلام کو آزاد کرنا لازم ہوگا پھر جسے یہ میسر نہ ہو وہ دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے، اللہ کی بارگاہ سے توبہ کا حکم جان کر اور اللہ بہت علیم و حکیم ہے۔''

قتل عمد

قتل انسانی کی دوسری شکل ''قتل عمد'' کہلاتی ہے۔ اِس کے تعلق سے حکم قرآنی حسب ذیل ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النسآء:۹۳)

''اور جو کوئی بھی کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ اُسی میں رہے گا اور اللہ کا غضب ہوا اُس پر اور اللہ کی اس پر لعنت ہے اور اُس نے اِس کے لیے بڑا عذاب تیار کر لیا ہے۔''

قتل عمد کی صورت میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ رحمتِ حق نے اپنا منہ ہی پھیر لیا ہے۔ یہ دونوں اقسام شبہ کی بناء پر اپنی ذیلی اقسام بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً شبہ بالخطاء وغیرہ۔ اور اِن متذکرہ بالا دونوں صورتوں میں خونِ ناحق کے تعلق سے ہی الہامی ہدایات وارد ہوئی ہیں۔ کسی انسانی جان کے ناحق قتل کی اِن دونوں اقسام میں فرق یہ ہے کہ قتل خطاء میں قاتل نے بالارادہ قتل نہیں کیا ہے۔ بلکہ قتل اگرچہ اُسی کے ہاتھوں سے ہوا ہے مگر اِس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ اُس سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہے جس کے نتیجہ میں کسی کی ناحق جان چلی گئی ہے۔ جبکہ قتل عمد میں قاتل نے بالارادہ مقتول کی جان لی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے قتل کی پہلی قسم اگر شدید ہے تو دوسری شدید تر ہے۔

قتل عام

جبکہ قتل انسانی کی ایک اَور قسم بھی قرآنِ حکیم میں مذکور ہے جو اِن مذکورہ بالا دونوں اقسام سے بھی بڑھ کر بدترین ہے اور وہ ہے: ''انسانی جانوں کا بے رحمانہ ضیاع یا قتل عام''۔ قرآنِ حکیم میں اِس کا ذکر حسب ذیل کلمات کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ

تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ رَحۡمَۃٌ فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ(البقرۃ:۱۷۸)

''اے ایمان والو! تمہارے ذمہ مقتولینِ قتلِ عام کا قصاص لینا فرض و لازم کر دیا گیا ہے، آزاد کی اپنی حیثیت ہے، اور غلام کی اپنی حیثیت ہے، اور عورت کی اپنی حیثیت ہے، تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو ذمہ داری ہے معروف کی پیروی اور ذمہ داری ہے اس کو بحسن و خوبی اس تک پہنچا بھی دینا، یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور سراسر رحمت ہے، تو جو بھی اس کے بعد ان حدود سے تجاوز کرتے ہوئے کسی عداوت کا تہیہ کرے گا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

فرضیتِ قصاص کی بنیاد بھی عام طور پر اسی آیۂ مبارکہ کو سمجھا اور قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ مطلقاً فرضیتِ قصاص کی بنیاد دراصل حسبِ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ

''اے اہلِ فہم و بصیرت ''قصاص'' ہی تمہارے لیے حیات بخشی کا ضامن ہے تاکہ تم میں تقویٰ کا جوہر مضبوط ہو سکے۔''

معروف مفسر فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

القصاص: هو ان يُفعَل بالانسانِ مثلَ ما فَعَل (۱)

''قصاص کا یہ ہے کہ انسان کے ساتھ ویسا ہی کچھ کیا جائے جیسا کہ اُس کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا ہے۔''

معانی القرآن میں ''کتب علیکم'' کا معنیٰ مرادی حسبِ ذیل بیان ہوا ہے۔

وقوله:"كتب عليكم" معناه فى كل القران: فُرِضَ عَلَيكم (۲)

''اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''کتب علیکم'' کا پورے قرآن حکیم میں معنیٰ مرادی ہے: ''تمہارے اوپر فرض کر دیا گیا ہے۔''

فخر الدین رازی ''فِی الۡقَتۡلٰی'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ای بسبب قتل الۡقَتۡلٰی ''یعنی: مقتولین قتلِ عام کو قتل کرنے کے سبب۔ پھر نحوی مباحث پر گفتگو کے بعد لکھتے ہیں:

فصار تقدير الآية: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجَبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ بَسَبَبِ قَتۡلِ الۡقَتۡلٰى۔ فدل ظاهر الآية على وجوب القصاص على جميع المؤمنين بسبب قتل جميع القتلىٰ (۳)

''تو اب اس آیہ مبارکہ کی لفظی ترتیب و ترکیب کچھ یوں واضح ہوتی ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے اوپر مقتولین کے قتل کے سبب قصاص لینا واجب ہو گیا ہے۔ بناء بریں آیہ مبارکہ کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا نظر آتا ہے کہ مقتولین کا قصاص لینا تمامی مؤمنین پر واجب ہو گیا ہے۔''

اب اِس ضابطہ کی رو سے مؤمنین کا شعورِ اجتماع اب اس بات کا پابند ہو جاتا ہے کہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اِس حکمِ الٰہی

پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔

جبکہ اوپر مذکور اور فی الوقت زیرِ بحث آیہ مبارکہ کے ضمن میں تحقیق سے پتا چلا ہے کہ عہدِ رسالت علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے بہت بعد کے وقتوں میں قرآنِ حکیم کی جب تفاسیر قلم بند کی جانے لگیں تو اُن ابتدائی وقتوں کے مفسرین کرام سے اِس آیہ کریمہ کے تعلق سے ممکنہ طور پر ایک فروگزاشت ہوگئی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ قرآنِ حکیم میں جو کلمہ وارد ہوا ہے وہ تو ہے: ''اَلْقَتْلٰی''، یعنی: ''قتلِ عام کے مقتولین''، مگر اِس کلمہ کی رعایت کو ملحوظ نہیں رکھا جاسکا اور اس کی جگہ جو تفسیر و تشریح ہوئی ہے وہ لفظِ ''اَلْقَتِیْل''، یعنی: ''ایک مقتول'' کے تعلق سے کردی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر لفظ تھا: ''اَلْقَتْلٰی'' اور اِس کو ''اَلْقَتِیْل'' فرض کرتے ہوئے اِس آیہ کریمہ کی تعبیر و تفسیر کی جاتی رہی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ لفظ کے بدل جانے سے بنیاد ہی تبدیل ہوگئی ہے اور اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ طے کرنا ہی مشکل ہوگیا ہے کہ یہ آیہ کریمہ قتلِ عمد کے تعلق سے ہدایات دیتی ہے یا کہ قتلِ خطاء ہے جو کہ اِس کا موضوعِ بحث ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ اِس کی کلی مطابقت کی کوئی سبیل بھی نہیں ہے۔ اِس حکمِ قرآنی کا بنیادی نکتہ ہے: ''یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی''۔ ''اے ایمان والو! تمہارے اوپر لازم کردیا گیا ہے قصاص، قتلِ عام کے معاملے میں''۔ یہ اصول تو غیر متنازعہ ہے اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے والا ہر صاحبِ فہم دانش شخص بھی اِسی سوچ کا حامل ہے کہ قرآنِ حکیم کے انتخابِ لفظی کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں قرآنِ حکیم کا انتخاب ہی '' اَلْقَتْلٰی '' ہے۔

کلمہ: ''اَلْقَتْلٰی''، جمع ہے بمعنی: ''مقتولین قتلِ عام'' اور اس کا واحد '' اَلْقَتِیْل '' ہے بمعنی: مقتول۔ (۴) معروف لغت نویس علامہ جوہری کے مطابق:

رجل قَتِیْلٌ، ای مقتولٌ ۔ و امرأۃ قَتِیْلٌ، و رجال و نسوۃ قَتْلیٰ۔

''عربی میں کہا جاتا ہے: ''رجل قَتِیْلٌ''، یعنی: ''مقتول آدمی'' اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ''امرأۃ قَتِیْلٌ''، یعنی: ''مقتولہ عورت''۔ اور اگر مقتولین کی تعداد زیادہ اور مرد و عورتیں سب شامل ہوں تو کہا جاتا ہے: ''رجال و نسوۃ قَتْلیٰ''۔ (۵)

علامہ منظور افریقی کے بقول:

رجل قَتِیْلٌ مَقْتُوْلٌ والجمع قُتَلَاءُ حکاہ سیبویہ وقَتْلیٰ و قَتَالیٰ۔۔۔ ولا یُجمَع قَتِیْلٌ جمعَ السلامۃِ لِانّ مؤنثہ لا تدخلہ الھاء (۶)

''عربی میں کہا جاتا ہے: ''رجل قَتِیْلٌ''، یعنی: ''مقتول آدمی'' اور اس کی جمع '' قُتَلَاءُ '' کے وزن پر آتی ہے، یہ بات سیبویہ نے کہی ہے۔ اور '' قَتْلیٰ '' اور '' قَتَالیٰ '' کے وزن پر بھی اِس کی جمع بنتی ہے۔ اور '' قَتِیْلٌ '' کی جمع سالم نہیں آتی اور وجہ اِس کی یہ ہے کہ '' قَتِیْلٌ '' کی مؤنث '' قَتِیْلَۃٌ '' کے وزن پر نہیں آتی۔

لہٰذا اِس معاملے کی کسی قدر تفصیل و تمثیل کی جائے تو صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ اگر خدانخواستہ ایک شخص کو کسی نے اِس محلے میں قتل کردیا ہے۔ اور کسی دوسرے شخص کو کسی اَور نے کہیں اَور جگہ پہ جان سے مار ڈالا ہے جبکہ کسی تیسرے شخص کو کسی اَور ہی شخص نے اُدھر اُس بستی میں مار ڈالا ہے اور کسی چوتھے شخص کو اَور ہی کسی شخص نے کسی اَور ہی بستی یا جگہ پہ قتل کردیا ہے۔ اب یہ سب ہیں تو

مقتول اور مجموعی طور پر اِن کی تعداد تین سے متجاوز بھی ہے۔لہٰذا مقتول کی بجائے مقتولین یعنی ''اَلْقَتْلٰی'' کہا گیا ہے۔اور چونکہ ہر قتل اپنی جگہ ایک قتل ہی ہے۔لہٰذا کیا مضائقہ ہے کہ لفظِ ''اَلْقَتْلٰی'' استعمال ہوا تو اِس سے اگر قتل ہی مراد لے لیا جائے۔نتیجہ بہر صورت قتل ہی تو ہے۔تفسیری ادب میں یہ تعبیری و تفسیری روایت اتنی پختہ اور عام ہے کہ کسی مخصوص حوالے کی یہاں حاجت ہی نہیں ہے۔یہاں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ متذکرہ بالا تمامی صورتوں کے لیے فقط لفظِ قتل ہی استعمال ہوسکتا ہے۔کیونکہ بہر حال یہ الگ الگ معاملات ہیں اور جداگانہ بنیادوں پر ہی وقوع پذیر بھی ہوئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ آیتِ مبارکہ میں کلمہ ''اَلْقَتْلٰی'' آیا ہے۔اس کا اپنا ایک الگ تھلگ اور جداگانہ نوعیت کا معنی و مفہوم ہے۔جبکہ قتل ایک الگ ہی شے ہے۔دونوں کے مابین ایک نمایاں اور بڑے فرق کی موجودگی میں اس کلمہ ''اَلْقَتْلٰی'' کو ''اَلْقَتِیْل'' پر محمول کرنے کا جواز کیا ہے؟اور اگر اس میں کسی کو کوئی مضائقہ ہی نظر نہیں آتا تو یہ فرمایئے کہ ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتِیْلِ'' کہنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ کیونکہ لفظِ قتل خود بھی عربی زبان کا ہی ایک لفظ ہے۔بلکہ ہمارے مبحث کی بنیاد ہی یہی اور اِس کے مشتقات ہیں،تو اس سے بطورِ اسمِ مفعول، واحد کے لیے موضوع و مستعمل کلمہ ''اَلْقَتِیْل'' سے صرفِ نظر کرتے ہوئے لفظِ ''اَلْقَتْلٰی'' کے انتخاب اور ورود سے کیا کوئی فرق ہی نہیں پڑتا؟

اگر ان سوالات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تو پھر یوں کہہ لیجیے کہ کم از کم اِس آیہ کریمہ سے ایک ایسا معنی و مفہوم برآمد ہوگا کہ کسی کے لیے قابلِ فہم یا قابلِ قبول نہیں ہوگا۔اِس کی صورت یہ بنتی ہے کہ فقط ایک یا دو قتل ہوجانے کی صورت میں آپ تو کسی قاتل کے خلاف کسی کارروائی کے مجاز ہی نہیں ہوں گے۔وہ یوں یہ کہ ''اَلْقَتْلٰی'' بھی وجوبِ ''قصاص'' کے لیے نصابِ زکوٰۃ کی طرح کا ایک نصاب بن کر سامنے آئے گا۔تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک یا دو آدمیوں کا قتل ہوجانا تو کوئی بات ہی نہیں۔نہ کسی فکرمندی اور پریشانی کا باعث ہے۔ہاں البتہ بڑھتے ہوئے مقتولین کی تعداد جب حدِ ''اَلْقَتْلٰی'' کو پہنچ جائے تو اے ایمان والو تم پر ان کا قصاص لینا لازم ہوجائے گا۔کیونکہ ایک یا دو قتل ہونے پر نہ تو ''اَلْقَتْلٰی'' کا اطلاق درست ہوگا اور نہ ہی کسی طرح اس حکمِ قرآنی کا طلاق اس صورتِ حالات پر درست بیٹھے گا۔اِس صورت میں یہ مضمون قرآنی تعلیمات سے براہِ راست متصادم بھی ہے۔کیونکہ خود قرآنِ حکیم دیگر مقامات پہ قتلِ عمد اور قتلِ خطاء دونوں کے احکامات جداگانہ بنیاد پہ بیان کرچکا ہے۔

اِس معاملے میں کوئی ابہام اور کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کی رُو سے لازم و فرض قرار دیا گیا قصاص صرف اور صرف ''قِصَاصُ الْقَتْلٰی'' ہے۔اِس سے مراد ''قِصَاصُ الْقَتِیْلِ'' یا ''قِصَاصُ الْقَتِیْلَانِ'' ہرگز نہیں ہے۔نہ ہی کسی طور اِس کلمے یعنی ''اَلْقَتْلٰی'' کو اِدھر سے اُدھر کیا جاسکتا ہے۔اور اگر کسی کا اصرار ہی ہے کہ ''قِصَاصُ الْقَتْلٰی'' کی بجائے اِس سے مراد ''قِصَاصُ الْقَتِیْلِ'' ہی لینا ہے تو گزارش ہے کہ پھر تو یہ صراحتِ لفظی سے عدول ہوگا بلکہ تحریفِ لفظی جیسے سنگین عمل کا ارتکاب ہی ہوگا۔اور کسی صاحبِ ایمان سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اِس غلطی کی نشاندہی ہوچکنے کے بعد بھی وہ دیدہ و دانستہ قرآن حکیم کے متن میں اِس تحریف و تصرف پر مبنی رویے و عمل کو جاری و ساری ہی رکھے گا۔اگر یہ معاملہ کسی پر ابھی تک واضح نہیں ہوسکا ہے تو اُسے چاہیے کہ اِس معاملے کو کراچی میں جاری بدامنی کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرے۔یہاں درجنوں افراد ایک ایک دن میں قتل ہوتے رہے ہیں۔مگر اخبارات و دیگر نیوز چینلز نے اتنی کثیر تعداد میں ہونے والی قتل کی اِن وارداتوں کو کبھی بھی ''قتلِ عام'' کا نام نہیں

دیا ہے اور نہ ہی یہ نام اِس طرح کے جداگانہ بنیادوں پہ ہونے والی متعدد وارداتوں کو دیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی قتلِ عام کا لفظ استعمال کرے گا بھی تو محض معاملات کی شدت کو بڑھا کر پیش کرنے اور زیادہ اور جرائم کی تعداد اور سنگینی کو زیادہ واضح کرنے کے لیے بطور مبالغہ ہی ایسا کرے گا۔ یا پھر دہشت گردانہ عزائم اور اسباب ومحرکات کی یکسانی کی جانب بطورِ اشارہ ہی یہ نام استعمال ہوگا۔ یہ وارداتیں جداگانہ بنیادوں پہ ہوں اور اسباب ومحرکات بھی الگ الگ ہی ہوں تو کسی بھی طرح سے ان تمام وارداتوں کو ''قتلِ عام'' کے عنوان کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ البتہ سانحہ آرمی اسکول پشاور میں معصوم بچوں اور دیگر عملے اور اساتذہ کرام کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی تھی اِس کو قتل کی بجائے ''قتلِ عام'' سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ یہی صورتحال نظر آتی ہے سانحہ صفورا میں بھی۔ اور جب بات ہو گی عربی زبان میں ایسی کسی ہولناک صورتحال کو لفظی جامہ دینے کی تو عربی میں اِس کو ''اَلْقَتْلٰی'' سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں اِسی نوعیت کے قتلِ عام کے تعلق سے ہی اللہ عزوجل کا حکم وارد ہوا ہے۔ اب ریاست اور ریاستی اداروں پہ اِس قتلِ عام کا قرآنِ حکیم کے اِس صریح اور واضح حکم کے تحت قصاص لینا لازم وضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جملہ مؤمنین کے شعورِ اجتماعی کے نمائندہ یہی ہیں۔ لہٰذا ریاست اور ریاستی اداروں نے اِس ضمن میں جو بھی اقدامات کیے ہیں اور مزید جو جو اقدامات بھی کیے جارہے ہیں وہ اللہ عزوجل کے اِس فرمانِ پاک پر عمل ہونے کے ناطے ایک خالص اسلامی حکم ہے اور شرعی طور پر جائز بلکہ ضروری اقدامات ہیں۔ اِن جملہ سانحات کا قصاص اِس حکمِ قرآنی کی رو سے حکومتِ وقت، پوری ریاست اور پوری قوم کے ذمہ قرض لازم اور واجب الادا فریضہ ہی رہے گا تا آنکہ ایسے ٹھوس عملی اقدامات اُٹھا لیے جائیں کہ قصاص لینے کا حق ادا ہو جائے۔

''اَلْقَتْلٰی'' کے تعلق سے یہ سوالات جن کا سطورِ بالا میں ذکر ہوا ہے، خاص توجہ کے طالب ہیں۔ لہٰذا اِس مقام پہ یہ جاننا اور معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ ''اَلْقَتْلٰی'' کو فقط از روئے لغت دیکھا اور اس کا معنی متعین کیا جائے؟ یا اس کلمہ کی کلام وعرفِ اہلِ عرب میں کوئی عرفی واصطلاحی حیثیت اور شناخت بھی تھی؟ ''قِصَاصُ الْقَتْلٰی'' کو ذہن میں رکھا جائے تو صاف اور سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے اِس حکم کا مصداق فقط ''قتلِ عام'' ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ ''اے ایمان والو! تمہارے اوپر قتلِ عام میں مارے جانے والوں کا قصاص لینا لازم وفرض کر دیا گیا ہے''۔

بقرہ کی آیت ۱۷۸ منسوخ ہے؟

علم وفن کے بعض ماہرین نے آیۂ زیرِ بحث کے منسوخ ہونے کی بابت بھی لکھا ہے۔ معروف نحوی الفرآء اپنی معروف کتاب ''معانی القرآن'' میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> انزل اللہ تبارك و تعالیٰ ھذا علی نبیه ، ثم نسخه قوله: "وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" الی اخر الایة۔ فالاولی منسوخة لا یُحکم بھا۔(۷)

علامہ جار اللہ زمخشری فرماتے ہیں:

''عمر بن عبد العزیز، حسن بصری، عطاء، عکرمہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ اِس آیتِ کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی آزاد مرد کو کسی غلام کے بدلے میں قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا اور کسی مرد کو کسی عورت کے بدلے میں بھی

قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ المائدہ کی آیت ۴۵ کے اندر وارد کلمات ''اَلنَّفْسَ بِالنَّفْس'' میں پائے جانے والے ابہام کو دور اور ان کی تفسیر کرتی ہے۔ یہ اِس لیے بھی کہ مذکورہ کلمات وہ ہیں جو اہل تورات کے لیے نازل ہوئے اور بطورِ حکایت قرآنِ حکیم میں وارد ہوئے ہیں۔ جبکہ زیر بحث البقرہ کی آیت ۱۷۸ میں ہم مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور اِس میں وارد حکمِ الٰہی ہم مسلمانوں پر لازم وواجب قرار پاتا ہے''۔ اِس ترجمہ کے بعد علامہ جاراللہ زمخشری کے آگے کے اپنے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

و عن سعيد ابن المسيب و الشعبى و النخعى و قتاده و الثورى، و هو مذهب ابى حنيفة: انها منسوخة بقوله: "اَلنَّفْسَ بِالنَّفْس (۸)

''اور سعید ابن المسیب، شعبی، نخعی، قتادہ اور ثوری سے مروی ہے اور یہی مذہب ہے امام ابوحنیفہ کا کہ یہ آیتِ کریمہ فرمان باری تعالیٰ: '' اَلنَّفْسَ بِالنَّفْس '' سے منسوخ ہے۔''

اب ایک اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ اگر فخر الدین رازی جیسا بڑا مفسر بقرہ کی آیت ۱۷۸ کو منسوخ قرار نہیں دیتا تو وجہ اس کی یہ نہیں ہے کہ اُن کے دلائل و براہین ایسے ہیں کہ ان کو ایسا کرنے سے روکتے ہیں۔ بلکہ وجہ یہ ہے آپؒ شافعی ہیں اور امام شافعی کے مسلک کے موافق ہی گفتگو کرتے ہیں۔ اِدھر علامہ جاراللہ زمخشری اگر چہ معتزلی الاصول ہیں مگر حنفی الفروع ہیں۔ اِس ناطے اگر اِس آیہ کریمہ کے منسوخ ہونے کا قول کرتے ہیں تو اپنے دلائل و براہین کی بنیاد پر ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنے امام کی پیروی میں ہی ایسا کرتے ہیں۔

تبادرِ ذہنی، فہم سخن میں ایک اہم کردار کا حامل عنصر ہے۔ تبادرِ ذہنی سے مراد یہ ہے کہ جب ہم کوئی کلمہ سنتے ہیں تو ہمارا ذہن جھٹ سے لپک کر ذہن میں پہلے سے موجود مواد میں سے اُس کے معنی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اِس کے ساتھ دوسرے کلمے اور اُن کے معانی بھی اِسی طرح غیر معمولی رفتار سے جڑتے اور ملتے رہتے ہیں اور ہم اُس کلام کو سمجھتے ہوئے آگے کی جانب رواں دواں رہ پاتے ہیں۔ اگر کسی کلمہ کے تعلق سے کوئی خاص معنی ذہن نشین ہو جائے تو مشکل یہ ہے کہ یہ تبادرِ ذہنی ہمیں باندھ پکڑ کر سیدھا سیدھا اپنے اُس خاص معنی تک لے جاتا ہے جو کہ پہلے سے ہی ذہن نشین چلا آیا ہے۔ پھر گرد و پیش میں موجود دیگر معانی و مطالب پر ہماری نگاہ ہی نہیں پڑتی۔ اور اگر ایسا نہیں ہے یا اس عنصر کی موجودگی کا کسی کو علم وادراک ہی نہیں ہے یا زمانہ ومحاورہ بدل جانے یا کسی اَور وجہ سے کسی کا اس طرف دھیان ہی متوجہ نہیں ہو سکا ہے تو نصوصِ قرآنی سے فہم معانی و مطالب میں دقت و دشواری یقینی ہے۔ ایک ایسی ہی دقت و دشواری کا سامنا ہمیں اس مقام پر بھی ہے۔ لہٰذا عہدِ جاہلی کے ادبی ذخیرہ سے رجوع ناگزیر ہو گیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ عرب اس کلمہ کو کس کس معنی میں لیتے تھے؟ اور کب اور کہاں استعمال میں لاتے تھے؟ دیوان حماسہ میں تأبط شرا کے مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔ ان میں مفرد اور جمع دونوں کلمات آئے ہیں:

إِنَّ بِالشِّعْبِ الَّذِى دُونَ سَلْعٍ   لَقَتِيلاً دَمُهُ مَا يُطَلُّ

تَضْحَكُ الضَّبُعُ لِقَتْلَى هذَيْل   وتَرَى الذِّئبَ لَها يسْتَهلُّ(۹)

''بلاشبہ سلع پہاڑ کے قریب گھاٹی میں ایک عظیم المرتبت مقتول دفن ہے جس کا خون رائیگاں نہیں جائے

گا، بنو ہذیل کے مقتولین کی کثرت پر مردہ خور بجو خوشی سے ہنس رہے ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بھڑیے بھی اس خوشی کے موقع پر چلا رہے ہوں گے۔''

دیوان حماسہ میں ہی ہے قال بعض بنی جُهَيْنَة فی وقعة کلب وفَزارة:

فَقَدْ تُرِكَتْ قَتْلی حُمَيْدِ بْنِ بَحْدَلٍ كَثيراً   ضَوَاحِيهَا قَليلاً دَفِينُهَا (۱۰)

''حمید بن بحدل کے مقتولین ایسی حالت میں چھوڑ دیے گئے کہ ان کی اکثریت کھلے میدان میں پڑی رہ گئی اور کم ہی تھے جو دفن ہوئے۔''

قَسامَة بن رواحة السنبسی کہتا ہے:

وَمـا زَالَ مِـنْ قَتْـلیٰ رَزَاحٍ بِـعـالِـجٍ   دَمٌ نـاقِـعٌ أوْ جَـاسِـدٌ غَيـرُ مَاصِحِ (۱۱)

''عالج کے مقام پر بنو رزاح کا تازہ اور خشک ہو جانے والا خون ہمیشہ رہے گا، اس کے نشانات مٹنے کے نہیں ہیں۔''

اسی طرح اَلْمُفَضَّلِيّات میں ہے:

يـطـأن من الـقتلی و مـن قِـصَـد القَنا   خبـارا فـما يجرين الا تجشما (۱۲)

اور اب آخر میں جمهرة اشعار العرب کے حوالے سے ایسے متعدد شواہد پر بھی نظر ڈال لیجیے جو کہ یکجا ہیں۔ معروف عرب شاعر خداش بن زہیر اپنے مُجَمْهَرَہ میں یہ کلمہ بتکرار استعمال کرتا ہے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ تمامی مقامات پہ اس کلمہ سے وہ ''قتل عام'' ہی مراد بھی لیتا ہے۔ اس کے حسبِ ذیل چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وإنّی لأشقَی النّاسِ، إن كُنتُ غَارِماً   لِعَاقِبَةٍ، قَتلی خُزَيْمَةَ و الخَضِرِ

أُكَلَّفُ قَتلی مَعْشَرٍ لَسْتُ مِنهُمْ   ولا أنا مَوْلَاهُم ولا نَصْرُهم نَصْرِی

يَقُولُونَ دَعْ مَوْلَاكَ نَأْكُلُهُ بَاطِلاً   ودَعْ عَنْكَ ما جرّتْ بُجَيْلَةُ مِنْ عُسْر

أُكَلَّفُ قتلی العِيصِ عيصِ شَواحِطٍ   و ذلك أمرٌ لا يُنَفّی لَكُم قَدْرِی

و قَتلی أَجَرّتُها فَوَارِسُ ناشِبٍ   بأزْنَم، خُرصانِ الرُّدَيْنِيّةِ السُّمْر

فَيَا أَخَوَيْنَا مِنْ أَبِينَا وَ أُمّنَا   إليكُم ! إليكُم ! لا سَبِيلَ إلی جَسْرِ (۱۳)

عرب باذوق لوگ تھے۔ زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے خوب واقف تھے۔ آخر کچھ وجوہات ایسی تھیں کہ جن کے باعث ان کو اپنی زبان دانی پر اتنا بہت سا ناز تھا۔ وہ جانتے تھے کہ محض چند اشعار میں ایک کلمے کی تکرار کلام کو غیر معیاری اور بوجھل بنا کر رکھ دے گی۔ کلام اہل عرب پر طعن وارد ہوگا۔ پھر آخر اس کی ایسی کیا مجبوری تھی کہ صرف چھ اشعار کے اندر یہ کلمہ چار مرتبہ نظر آتا ہے؟ فقط عرف و عادتِ اہلِ عرب کے لحاظ نے شاعر کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ اس کلمہ کو ان اشعار میں دہراتا چلا جائے۔ بناء بریں یہ عربوں کی اصطلاح خاص ہے

مقتولین جنگ کے لیے۔ یا کسی بھی قتل عام کی واردات میں مارے جانے والوں کے لیے۔ ادھر اُدھر مارے جانے والے انفرادی نوعیت کے واقعات تعداد کے لحاظ سے متعدد ہو کر بھی اس کلمہ کے ذیل میں نہیں آتے۔ یہ بھی غور فرمائیے کہ شواہدِ مندرجہ بالا میں کسی ایک جگہ اور کسی شاعر نے بھی ''اَلْقَتْلٰی'' کو اس معنی میں نہیں لیا ہے جس معنی میں ہمارے ہاں اسے لیا اور سمجھا گیا ہے۔ ان تمام شواہد اور ماسوا ذالک میں یہ کلمہ مقتولین جنگ یعنی قتل عام کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر واحد کے مقتولین کے لیے بھی یہی کلمہ رائج و شائع ہے۔ جنگ صفین تک ہمیں یہی کچھ دکھائی دیتا ہے۔ حضرت علی اور امیر معاویہ کے مابین ہونے والی اس جنگ کے مقتولین کے تعلق سے حضرت علی کی جانب منسوب قول میں بھی یہی کلمہ آیا ہے:

قَتْلَایَ وَ قَتْلٰی مُعَاوِیَةَ فِی الْجَنَّةِ (۱۴)

''قتل عام میں مارے جانے والے میرے اور معاویہ کے حامی جنتی ہیں۔''

ایک عام آفت سے نمٹنے اور اسے ٹالنے کا طریقہ اَور ہوسکتا ہے۔ شخصی اور انفرادی فعل پر یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کو جان سے مار ڈالے تو گرفت کی نوعیت اَور ہی ہوتی ہے۔ عہدِ جاہلیت کے جنگ و جدال میں صلح وصفائی اور امن کی بحالی کے لیے عام معافی بصورتِ دیت کے سوا اَور کوئی راستہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ لہٰذا ایک باقاعدہ ریاست اور اس کے اداروں کی غیر موجودگی کے باعث رواج یہ تھا کہ ان کے بڑے قد آور اور صاحبِ حیثیت لوگ بیچ میں پڑتے۔ فریق مظلوم کے مقتولین کی دیت کی ادائیگی کو لازم کیا جاتا۔ بہت مرتبہ یہ بارِ دیت خود اپنے ذمہ لے لیا جاتا تھا۔ خداش بن زہیر کے مُجَمْہَرْ ہسے ماخوذ اشعار میں اس امر کی متعدد شہادتیں موجود ہیں۔ اسی طرح ھرم بن سنان اور حارث بن عوف کا کردار بھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ ان دونوں کا ذکر عہدِ جاہلیت کے مشہور شاعر اور صاحبِ معلقہ زہیر بن ابی سلمی مری نے اپنے معلقہ میں کیا ہے۔ دیوان زہیر کا شارح اور مقدمہ نگار علی حسن فاعور اپنے مقدمہ میں ''ایام العرب فی الجاہلیة'' کے حوالے سے لکھتا ہے:

نَظَمَ مُعَلَّقَتَهٗ دَاعِیاً اِلَی الْبِرِّ وَ الْوَفَآءِ مُشَیِّدًا بِمُرُوْءَةِ هَرَمِ بْنِ سِنَانَ وَ الْحَارِثِ بْنِ عَوْفٍ، اَلَّذَیْنِ سَعَیَا فِی الصُّلْحِ وَ تَحَمَّلَا دِیَاتَ "اَلْقَتْلٰی" وَ هِیَ ثَلَاثَةُ الَافِ بَعِیْرٍاَدَّیَاهَا فِیْ ثَلَاثِ سِنِیْنَ (۱۵)

''زہیر نے اپنا قصیدہ نیکی اور وفاداری کا داعی بن کر اور ھرم بن سنان اور حارث بن عوف کی شانِ مردانگی کا قصیدہ خواں ہو کر نظم کیا ہے۔ یہ دونوں وہی شخصیات ہیں جنھوں نے (قبیلہ عبس وقبیلہ ذبیان کے مابین ہونے والی خوں ریز جنگ ''حرب داحس وغبرا'' میں) صلح کروانے کے لیے کوشش کی اور مقتولین کی دیت کا بار اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔ یہ دیت تین ہزار اونٹ تھی جسے دونوں نے تین سال پر محیط مدت میں ادا کیا تھا۔''

قرآن حکیم میں یہ کلمہ ''اَلْقَتْلٰی'' بس ایک ہی جگہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں ہی آیا ہے۔ کلمہ کی معنوی تعیین سے یہ امر طے ہو جاتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی اِس آیت کا حقیقی مصداق قتل عام یعنی جنگ وجدال کے مقتولین ہیں جو کہ ایک اجتماعی معاملہ ہے۔ عام فتنہ

اور آفت ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ اس اجتماعیت کی بعض خاص صورتوں میں انفرادیت کی جھلک بھی کبھی پیدا ہو جاتی تھی۔ جس طرح جنگ بدر میں ابو جہل کو مارنے والوں کے بارے میں سب کو علم تھا اور ہے۔ اسی طرح حضرت سید الشہدا ء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے شخص کی بھی شناخت ہوگئی تھی وغیرہ ذٰ لک۔ اب چونکہ یہ واضح ہوگیا ہے کہ یہ کلمہ عہدِ جاہلیت میں بمعنی ''قتلِ عام'' استعمال ہوا ہے یعنی یہ خونریز معرکوں میں، جہاں گھمسان کا رن پڑتا تھا، مارے جانے والے لوگوں کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ اس لیے عہد حاضر کے باہمی جھگڑوں، خاندانی تنازعات یا لوٹ مار اور ڈکیتیوں وغیرہ کے دوران مارے جانے والے انفرادی نوعیت کے معاملات اس کے ذیل میں نہیں آتے۔ نہ ہی ان کا معاملہ از ہمہ پہلو ان کے مماثل ہے۔ اِس نوع کے واقعات کو ''قتل'' کی واردات ہی کہا جائے گا۔

صلح وصفائی کی صورت میں متذکرہ بالا خون آشام جنگوں کے مقتولین کا خون بہا دینے کا رواج بھی قدیمی تھا۔ بصورت دیگر جنگ جاری رکھی جاتی اور مخالفین کو ایسے جانی نقصان سے دوچار کر دیا جاتا تھا کہ آج بھی ان کے قصے پڑھتے ہوئے ہول آتا ہے۔ جنگ کا اس طرح جاری رہنا بھی قصاص ہی کی ایک صورت تھی۔ الا یہ کہ اس میں پورے قبیلے کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ قبیلے قاتلوں کی سپردگی دینے کی بجائے حمایت میں ان کی پشت پر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور اُن کو تحفظ وتعاون مہیا کیا کرتے تھے۔ یہ جرم پروری اور اِس جرم میں عملی مشارکت کا اظہار ہے۔ بایں وجہ قصاص کی اس شکل میں قاتل اور غیر قاتل کی تمیز قائم نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ مگر جنگ وجدال کی صورت میں قصد وارادہ ٔ قتل کے معاملے میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی خاص ضرورت اور معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ اس ''قتلِ عام'' کو ''قتالِ عمد'' کا خصوصی نام دیا جائے۔ اِس کی بجائے عربوں کے پاس اِس صورتِ معنیٰ کو لفظی جامہ دینے کے لیے '' اَلْـقَـتْـلـٰی '' کی صورت میں ایک خوبصورت وجامع اور فصیح وبلیغ لفظ موجود ہے۔ اور موقع بموقع وہ اِسی کا سہارا لیتے رہے ہیں۔

ہمارے ہاں قتل کی دو اقسام کی گئی ہیں۔ عمد اور خطاء۔ قتل خطاء کے معاملے میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ حکم بہت واضح اور معلوم ومتعین ہے۔ مگر قتل عمد کے معاملے میں یہی ایک التباس واقع ہوا ہے۔ قتال یعنی جنگ وجدال جو کہ دراصل قتل عمد ہی کی ایک زیادہ بھیانک اور خوفناک صورت ہے اور جس میں ''قتلِ عام'' کے سانحات رونما ہوتے ہیں، کو ''قتل عمد'' سے الگ کر کے نہیں دیکھا گیا۔ مگر ان دونوں میں یک گونا فرق ہے اور حکم بھی دونوں کا جدا جدا ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر تین متباین وممتاز از یک دگر معاملات میں قرآن حکیم کے اندر تین طرح کے احکام وارد ہوئے ہیں۔ اب ہوا یہ کہ ان میں سے دو یعنی قتل عمد اور قتل عام اپنے اپنے مقام سے الگ ہو کر غیر محسوس طریقے پر ایک دوسرے میں ضم ہوگئے ہیں۔ ان میں سے ہر حکم کی اپنی ایک جداگانہ نوعیت کی ہیئتِ حاکمہ تھی۔ ملاپ کے باعث وہ جداگانہ تشخص جاتا رہا تو ابہام اَور بھی زیادہ شدید ہوگیا۔ قتل عام کے تعلق سے وارد احکام میں دیت کی گنجائش ایک قدیمی روایت اور بڑی ضرورت اور مجبوری تھی جسے قائم رکھا گیا ہے۔ اِس ابہام کے باعث اِس دیت کے ڈانڈے قتل عمد سے بھی ملا دیئے گئے ہیں۔ گویا حسب دستور تاویلات کے در کھل گئے ہیں۔ مگر حقیقت تاویلات کے انبار تلے دب کر بھی جی لیتی ہے۔ اور قرآن حکیم کے معنوی اعجاز کی شان یہ ہے کہ اِس کو کبھی بھی دفن کر کے اوپر سے مٹی نہیں پھیری جا سکتی۔ یہ زندہ وجاوید

کتاب اپنے معانی ومفاہیم کو بھی ابدی اور لازوال بنائے ہوئے ہے۔ اِن متذکرہ بالا تینوں احکام سے متعلقہ آیات بہت واضح اور احکام روشن ہیں۔ ان میں کسی بھی طرح کا کوئی خفاء نہیں ہے۔ البتہ ہر آیتِ مبارکہ کا اپنا الگ ہی محل ہے اور جداگانہ نوعیت کا ہی مستدل ہے۔ جب ان کو باہمدگر خلط ملط کر دیا گیا تو قاری کے ذہن میں الجھن نے جگہ پکڑ لی۔ ہمارے اوپر قتال یا قتلِ عام اور قتلِ عمد کے احکام کبھی باہمدگر مخلوط نہ ہوتے اگر ریاست مدینہ کے زمینی حالات ہماری نگاہوں کے سامنے رہتے۔ مدینہ منورہ کی حدود میں روز روز اور جابجا لاشیں گرنے کا کوئی معمول نہیں تھا۔ اور نہ ہی بدامنی و بدانتظامی کی کوئی ایسی روایات دستیاب ہیں جنہیں دیکھ کر شہر کراچی کے مناظر نگاہوں کے سامنے پھر جائیں۔ خال خال اور کوئی اکادکا آدمی اگر کبھی یا کہیں مارا جاتا تھا تو بتائیے، اس صورتحالات میں، شخصی وانفرادی طور پر ہونے والے قتل کے کسی معاملے میں حکمِ قصاص کو لفظ ''اَلْقَتْلٰی'' سے بیان کرنے کی کوئی صورت ممکن رہ جاتی ہے؟ ہاں البتہ معرکۂ بدر واحد نے فریقین کے مابین جو جنگی حالات پیدا کر دیئے تھے ان کے تسلسل میں اگرچہ صلح حدیبیہ بھی حائل ہے مگر جنگی حالات کے عمومی تاثر کا تسلسل برقرار ہی رہا۔ تا آنکہ مکہ فتح ہو گیا اور حسبِ ذیل فرمان باری تعالیٰ کے جملہ تقاضے پورے ہو گئے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ:۱۹۳)

''اور ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ نابود ہو جائے اور دین بس اللہ ہی کا ہو کر رہ جائے تو اگر باز آ جائیں تو پھر طاقت کا استعمال بس ظالموں پر ہی ہوگا۔''

کوشش بسیار کے باوجود ہمیں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کو ''قتال'' یعنی جنگ سے غیر منسلک کرنے اور ادھر یا اُدھر قتل ہونے والے کسی مقتول پر منطبق کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر آئی ہے نہ کوئی جواز ہاتھ آ سکا ہے۔ لہٰذا اس تحقیق کی رُو سے لفظ ''اَلْقَتْلٰی'' کے ورود کے باعث اس آیۂ مبارکہ سے مراد قتل عام یا جنگی مقتولین کا قصاص ہی ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸، جسے قتل عمد کے حکم سے جوڑا گیا تھا، کی اپنی ایک جداگانہ اور ممتاز حیثیت ہے۔ اس کی رُو سے بصورتِ ''قتل عام'' بھی حکم قصاص کو فرض ولازم کر دیا گیا ہے۔ قتال کی صورت میں حکم یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی تو قصاص لازم ہے البتہ دیت کی گنجائش بھی اس میں موجود ہے۔ آیت مبارکہ میں وارد فقرات: '' فَمَنْ عُفِيَ لَه مِنْ اَخِيْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ '' کی ترکیب وبندش سے پوری طرح عیاں ہے کہ احسن طریق پر ادائیگی آخری حد ہے۔ اس سے کلی معافی کا انتفاء ظاہر ہے۔ دیت تک معاملے کا آ جانا حالانکہ بقرہ ۱۷۹ کے تحت قدرت نے حیاتِ انسانی کی حفاظت کو نظامِ قصاص کے قیام سے مشروط ومربوط فرما دیا تھا مزید برآں یہ قبول دیت فرمان باری تعالیٰ:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهٗ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ، لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ '' (الانفال: ۶۷و۶۸) سے متبادر وماخوذ ضابطے کے تحت سراسر: '' تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ '' ہے۔ اس دیت کے معاف نہ ہونے کی وجہ بھی ظاہر ہے اور وہ ہے ''قتال'' جو دانستہ عمل ہے اور قتل عام کی بدترین شکل ہے۔ مگر ایک عام آفت ہے۔ اور فتنۂ عظیم ہے۔ اور اگر دیت کے ذریعے اِس کا حل نہیں نکالا

جاتا تو قتل عام کے تسلسل کو روکنے کی کوئی صورت ہی نہ بچتی۔ حالانکہ اسلام جو کہ لفظ سلامتی ہی سے مشتق ہے بہرصورت تحفظِ حیاتِ انسانی کی ضمانت چاہتا ہے۔ قتلِ عام میں بھی کلی حکم قصاص ہی ہے جبکہ استثنائی شکل میں دیت بھی ہے۔ دیت نہ ہوتی یا قصاص کے سوا باقی راہیں مسدود ہو جاتیں تو لامحالہ قتل و غارت گری کا تسلسل ہی جاری رہتا۔ اِس لیے اِس استثنائی دیت کے ذریعے بھی دراصل تحفظ حیاتِ انسانی کو ہی یقینی بنایا گیا ہے۔

حاصل بحث کو مندرجہ ذیل نکات میں واضح کیا گیا ہے:

i۔ قتل انسانی کی سب سے خوفناک اور بھیانک شکل وصورت ''قتل عام'' ہی ہے۔ سانحہ آرمی پبلک اسکول پشاور، سانحہ واہگہ بارڈر، سانحہ صفورا چورنگی کراچی وغیرہ اِسی قتلِ عام کی خوفناک مثالیں ہیں۔ اور قرآنِ حکیم نے اگر چہ قتلِ عام کی صورت میں بھی استثنائی شکل میں دیت کی گنجائش بھی رکھی ہے مگر اِس کا عمومی قرآنی حکم فقط قصاص ہی ہے۔ اِس کی سنگینی کے پیشِ نظر اِس کو باقی شکلوں پہ مقدم رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں اِسی کا ذکر ملتا ہے۔ ارشادِ ہے:

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى "۔

''اے ایمان والو! تمہارے ذمہ رقم کر دیا گیا ہے قصاص قتلِ عام کے معاملے میں۔''

ii۔ انسانی جان کے اہلاک وزیاں کی دوسری شکل ہے: ''قتل''۔ یہ انفرادی نوعیت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی آگے مختلف اشکال و اقسام ہیں۔ مثلاً قتل عمد اور قتل خطاء یا قتل شبہ بالخطاء وغیرہ۔

iii۔ قتل خطاء غفلت ولاپرواہی پر مبنی ایسی حرکت ہے جس سے ناحق کسی انسان کی جان چلی گئی۔ اس صورت میں قصاص نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ارادۃً ایسا نہیں کیا گیا۔ مگر ایسی غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا کہ خون ہوگیا۔ سرزنش کیلیے یہاں دیت کو مشروع کیا گیا ہے۔ البتہ ایک غیرارادی اور نادانستہ عمل ہونے کے ناطے ورثاء کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اسے معاف بھی کر سکتے ہیں۔ (نساء ۹۲)

iv۔ قتل عمد کے احکام بھی بہت واضح ہیں۔ یہ احکام سورۂ نسآء کی آیت: ۹۳، اور سورۂ اسراء کی آیت ۳۳ میں موجود ہیں۔ قتل عمد کی صورت میں صرف قصاص ہے۔ دیت نہیں ہے۔ اس کے تعلق سے دیت کی راہ ہموار کی گئی تھی بقرہ کی آیت ۱۷۸ کے تحت مگر زیر نظر تحقیق بتاتی ہے کہ اِس آیت کا قتل عمد کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ لہٰذا قتل عمد کے معاملے میں دیت کا یا ورثاء کی طرف سے قاتل کے ساتھ صلح یا اُس کو معاف کر دینے کا کہیں کوئی اختیار از روئے شرع ثابت نہیں ہوتا۔ قانون قصاص میں شامل یہ نکتہ قرآنی حکمِ قصاص سے انحراف ہے۔

یہ امر اب بہت واضح ہے کہ ''قتل عام'' کی شکل ونوعیت الگ اور اس کا حکم بھی الگ ہی ہے۔ جبکہ قتل عمد اِس سے بہت مختلف ہے۔ اب سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۹ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اے اہل دانش! قانون قصاص ہی تمہارے لیے تحفظ حیات کی ضمانت ہے۔ ارشادِ باری ملاحظہ کیجیے:

وَ لَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ:۱۷۹)

''اے اہل فہم وبصیرت ''قصاص'' ہی تمہارے لیے حیات بخشی کا ضامن ہے تاکہ تم میں احتیاط وتقویٰ کا

جوہر مضبوط ہوجائے۔''

اِس آیہ کریمہ کی روشنی میں اور سماجی و معاشرتی حوالے سے دیکھا جائے تو قتل کا معاملہ ہو یا قتلِ عام کا اِن دونوں صورتوں میں قرآن حکیم نے ایک اجتماعی حیات کے نقطۂ نگاہ سے انسانی قوتِ برداشت کو زیرو کی سطح پہ پہنچا دیا ہے۔ انسانی معاشرے میں پائے جانے والے ان سب سے بڑے اور تباہ کن جرائم کے معاملے میں قانون یا حکمرانوں کی کوئی بھی رحمدلی یقیناً معاشرے اور قوم کے لیے موت کا پیغام ہوگی۔ اپنے اندرونی قومی و ملکی معاملات میں اقوام متحدہ سمیت کسی کا دباؤ قبول کرنا اور اس کے آگے سرنگوں ہو جانا بھی ایک سنگین شرعی و قومی جرم ہے۔ بلکہ یہ انحراف، متذکرہ بالا قتل ایسے تمامی جرائم سے بھی اِس معنی میں زیادہ سنگین ہے کہ ان کے تحفظ کا ضامن بن رہا ہے۔ لہٰذا حکم قرآنی کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے متذکرہ بالا تصریحات کے مطابق قصاص کو بہر قیمت یقینی بنانا ضروری ہے۔ اگر قتل ہے تو اُس کے تعلق سے قرآنی رہنمائی اور متعلقہ مقامات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ ''قتلِ عام'' کا کہیں معاملہ ہے تو اُس کا حکم بھی اب واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کا تعلق جنگی جرائم اور ان سے مشابہ سرگرمیوں یعنی قتلِ عام سے ہی ہے۔

لہٰذا پاک فوج اور دیگر ریاستی اداروں کے اہلکار کسی بھی منفی پروپیگنڈہ میں نہ آئیں۔ ان کا عمل کسی بھی طرح سے شریعت اور اس کے اصولوں سے متصادم یا ان کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ ضربِ عضب سمیت جملہ اپریشنز وقت کی سب سے بڑی ضرورت بن چکے تھے۔ اِس مقام پہ قومی ضرورت اور شرعی تقاضے ایک ہی ہیں۔ کیونکہ سانحہ آرمی پبلک اسکول پشاور اور اِس طرح کے دیگر واقعات کے ذمہ داروں کو کھل کھیلنے کی اجازت دینا سنگین شرعی و قومی جرم ہوگا۔ اِس خونخوار گروہ کے کارندوں کے حلیہ و لباس یا اِن کے قرآن قرآن کرنے سے کسی دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں میں جب بھی کوئی گروہ سبوتاژ کی طرف مائل ہوا ہے تو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ہی اُس نے یہ واردات کی ہے۔ کیونکہ اپنی اصلیت ظاہر کر دینے کی صورت میں انہیں پذیرائی نہیں مل سکتی۔ مگر برتن سے وہی کچھ برآمد ہوتا ہے جو کچھ اُس میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے قتلِ عام ایسے گھناؤنے جرائم نے اِن لوگوں کے اصل چہرہ کو پوری طرح سے اب دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ اسلام کے پاسدار ہرگز نہیں ہیں۔ اگر خود کو علمبردار ظاہر کرتے ہیں تو بات بس اتنی سی ہے کہ باطل بہت کمزور ہوتا ہے اور کبھی بھی اِس قابل نہیں ہوتا کہ خود کو باطل ظاہر کرتے ہوئے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ باطل ہمیشہ حق کی آڑ لے کر ہی اپنی من چاہی مذموم واردات کیا کرتا ہے۔

۷۔ ریاست، اِس کے ادارے اور اِن کے تحت برسرِ کام افراد اِس صریح حکم قرآنی پر عمل پیرا ہیں۔ یہی فی الواقع مجاہدانہ کردار ہے۔ اور اِس طرف سے جو بھی ریاستی افراد یا اہلکار اپنی قوم اور وطن عزیز کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں بلاشبہ وہ قومی ہیرو ہیں۔ فقط یہی لوگ اللہ اور اُس کے رسول کے سچے اور مخلص ماننے والے ہیں اور شہید یا غازی کے بلند ترین رتبہ پہ فائز ہیں۔

مراجع وحواشی

۱۔رازی،محمد بن ضیاءالدین عمر،فخرالدین،مصر،مکتبۃ البھیہ ،طبع ثالث،ص:۵۱و۵۲،ج:۳،ح:۵

۲۔الفرآء،معانی القرآن،بیروت،عالَم الکتب،طبع ثانی ۱۹۸۰ء،ص:۱۰۹،ج:۱

۳۔رازی،محمد بن ضیاءالدین عمر،فخرالدین،مصر،مکتبۃ البھیہ ،طبع ثالث،ص:۵۲،ج:۳،ح:۵

۴۔بلیاوی،عبدالحفیظ،مصباح اللغات،ص:۶۴۶،دہلی،مکتبہ بُرہان اردو بازار جامع مسجد،مئی ۱۹۶۲ء، مادّہ:''ق ت ل''

۵۔جوہری،الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ،بیروت،دارالعلم،ص:۱۷۹۸،ج:۵

۶۔منظورافریقی،محمد بن مکرم بن منظور،لسان العرب،ریاض،وزات مذہبی امور،بلاسنِ طباعت،ص:۶۴،ج:۱۴

۷۔الفرآء،معانی القرآن،بیروت،عالَم الکتب،طبع ثانی ۱۹۸۰ء،ص:۱۰۹،ج:۱

۸۔زمخشری،محمود بن عمر،جاراللہ،الکشاف،ایران،نشرادب الحوزۃ،بلاسن طباعت،ص:۲۲۰،ج:۱

۹۔ابوتمام حبیب بن اوس الطائی،دیوان حماسہ،کراچی،میر محمد کتب خانہ،بلاسنِ طباعت،ص:۱۴۲ و ۱۴۴

۱۰۔ابوتمام حبیب بن اوس الطائی،دیوان حماسہ،محولہ بالا،ص:۸۸

۱۱۔ابوتمام حبیب بن اوس الطائی،دیوان حماسہ،محولہ بالا ،ص:۱۶۵

۱۲۔ابوالعباس، المفضل بن محمد الضبی،اَلْمُفَضَّلِیّات،مع شرح عمر فاروق الطباع،بیروت،دارارقم،طبع اول ۱۹۹۸ء،ص:۵۵،

۱۳۔ابوزید،محمد بن ابی زید القرشی، جمھرۃ اشعار العرب،مع شرح عمر فاروق الطباع،بیروت،دارارقم،بلاسن طباعت،ص:۶۳-۱۶۲،

۱۴۔الطبرانی،سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر،بیروت،داراحیاء التراث الاسلامی،ص:۳۰۷،ج:۱۹(ح:۶۸۸)

۱۵۔فاعور،علی حسن،شرح دیوان زہیر بن ابی سلمی مری،بیروت،دارالکتب العلمیہ،طبع ثالث ۲۰۰۳ء،ص:۵